انکارِ حدیث.....حق یا باطل
(ایک منکرِ حدیث کے شبہات کے جوابات)

تحریر: فضیلۃ الشیخ مولانا صفی الرحمان مبارکپوریؒ

کیا قرآن مجید میں سب کچھ ہے اور حدیث کی ضرورت نہیں؟

انکار حدیث کیلئے سب سے اہم اور بنیادی نکتہ یہ تلاش کیا گیا ہے کہ قرآن مجید میں ہر مسئلہ کی تفصیل بیان کر دی گئی ہے اس لئے حدیث کی ضرورت نہیں۔ اس کے ثبوت میں قرآن مجید کے متعلق ﴿تِبْيَانًا لِكُلِّ شَيْءٍ﴾ اور ﴿تَفْصِيلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ﴾ والی آیات پیش کی جاتی ہیں جن کا مطلب توڑ مروڑ کر اور غلط ملط بیان کر کے یہ یقین دلایا جاتا ہے کہ قرآن مجید میں ہر مسئلہ کی تفصیل موجود ہے۔

۱۔ منکرین حدیث اب ہمارا سوال سنیں، قرآن مجید میں مردار، خون، سور کا گوشت اور غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا ہوا جانور حرام قرار دیا گیا ہے اور ''بَهِيْمَةُ الْاَنْعَام'' حلال کیا گیا ہے۔ ''بَهِيْمَةُ الْاَنْعَام'' کی تفسیر قرآن میں ان جانوروں سے کی گئی ہے، اونٹنی، اونٹ، گائے، بیل، بکری، بکرا، بھیڑ اور مینڈھا۔ لغت میں بھی ''بَهِيْمَةُ الْاَنْعَام'' کی فہرست میں یہی جانور بتائے گئے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ ان کے علاوہ دنیا کے بقیہ جانور حلال ہیں یا حرام؟ مثلاً کتا، بلی، گیدڑ، بھیڑیا، چیتا، شیر، تیندوا، بندر، ریچھ، ہرن، چیتل، سانبھر، بارہ سنگھا، بھینسا، خرگوش، کوا، چیل، باز، شکرہ، کبوتر، مینا، فاختہ وغیرہ وغیرہ۔ یہ سارے جانور حلال ہیں یا حرام؟ یا ان میں سے کچھ حلال ہیں اور کچھ حرام؟ آپ جو جواب بھی دیں اس کا ثبوت قرآن سے پیش کریں۔ آپ کی عقلی تُک بندیاں نہیں مانی جائیں گی۔ یعنی آپ چونکہ دعویدار ہیں کہ ہر مسئلہ قرآن میں موجود ہے اس لئے ان جانوروں میں سے جس کو حلال مانیں اس کے حلال ہونے کا ثبوت قرآن سے دیں اور جس کو حرام مانیں اس کے حرام ہونے کا ثبوت قرآن سے دیں اور اگر آپ قرآن سے نہ دے سکیں (اور یقیناً نہیں دے سکیں گے) تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن میں ہر مسئلہ بیان نہیں کیا گیا ہے اور حدیث کی ضرورت ہے۔ کیونکہ ان جانوروں کے حلال و حرام ہونے کا قاعدہ حدیث میں بیان کر دیا گیا ہے جس سے فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ کون سا جانور حلال ہے اور کون سا حرام.....!!!

۲۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ قرآن مجید میں نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ نماز کی حالت میں کھڑے ہونے، رکوع کرنے اور سجدہ کرنے کا ذکر بھی قرآن میں ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ نماز میں پہلے کھڑے ہوں یا پہلے رکوع کریں یا پہلے سجدہ کریں؟ پھر کھڑے ہوں تو ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوں یا لٹکا کر؟ ایک پاؤں پر کھڑے ہوں یا دونوں پر؟ لغت میں رکوع کا معنی ہے جھکنا، سوال یہ ہے کہ آگے جھکیں یا دائیں جھکیں یا بائیں جھکیں؟ پھر جھکنے کی مقدار کیا ہے؟ ذرا سا سر نیچا کریں یا کمر کے برابر نیچا کریں یا اس سے بھی زیادہ نیچا کریں؟ پھر رکوع کی حالت میں ہاتھ کہاں ہوں؟ گھٹنوں پر ٹیکیں یا دونوں رانوں کے بیچ میں رکھ کر بازوؤں کو ران پر ٹیکیں یا ڈنڈے کی طرح لٹکنے دیں؟

اسی طرح سجدہ کیسے کریں؟ یعنی زمین پر سر کا کون سا حصہ ٹیکیں، پیشانی کا ٹھیک پچھلا حصہ یا دایاں کنارہ یا بایاں کنارہ؟ سجدہ کی حالت میں ہاتھ کہاں رکھیں؟ رانوں میں گھسا لیں یا زمین پر ٹیکیں؟ اور اگر زمین پر ٹیکیں تو صرف ہتھیلی زمین پر ٹیکیں یا پوری کہنی زمین پر ٹیکیں؟ سجدہ ایک کریں یا دو کریں؟ ان سوالات کا آپ جو بھی جواب دیں، اس کا ثبوت قرآن سے دیں۔ ان مسائل کے بارے میں آپ کی عقلی تُک بندیاں نہیں مانیں جائیں گی اور اگر قرآن سے ان سوالات کا جواب نہ دے سکیں (اور یقیناً نہیں دے سکتے) تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ حدیث کے بغیر قرآن کے حکم پر بھی عمل نہیں ہوسکتا۔

۳۔ تیسرا سوال یہ ہے کہ قرآن میں زکوٰۃ وصول کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ نہ دینے والوں کو سخت عذاب کی دھمکی بھی دی گئی ہے۔ جس جس قسم کے لوگوں پر زکوٰۃ خرچ کرنی ہے انہیں بھی بتا دیا گیا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ یہ زکوٰۃ کب کب وصول کی جائے؟ یعنی زکوٰۃ روز روز دی جائے یا سال بھر میں ایک مرتبہ دی جائے یا پانچ سال یا دس سال یا بیس سال میں ایک مرتبہ دی جائے یا عمر بھر میں ایک مرتبہ دی جائے؟؟ پھر یہ زکوٰۃ کس حساب سے دی جائے اور کتنی کتنی دی جائے؟ یعنی غلہ کتنا ہو تو اس میں زکوٰۃ دی جائے اور کتنے غلہ پر کتنی زکوٰۃ دی جائے؟ سونا چاندی کتنی ہو تو زکوٰۃ دی جائے اور کس حساب سے دی جائے؟ یہ سارے مسئلے قرآن سے ثابت کیجئے۔ اگر آپ قرآن میں یہ مسائل نہ دکھلا سکیں (اور ہرگز نہیں دکھلا سکتے) تو ثابت ہوگا کہ حدیث کو مانے بغیر قرآن کے حکم پر بھی عمل ممکن نہیں ہے، کیونکہ ان سارے مسائل کا بیان حدیث ہی میں آیا ہے۔

۴۔ چوتھا سوال: قرآن میں حکم ہے کہ مسلمان جنگ میں کفار کا جو مالِ غنیمت حاصل کریں اس کے پانچ حصے کر کے ایک حصہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے نام پر الگ نکال دیا جائے جو یتیموں، مسکینوں اور حاجت

مندوں وغیرہ میں بانٹ دیا جائے۔سوال یہ ہے کہ باقی چار حصے کیا کئے جائیں؟ تمام مجاہدین پر برابر برابر بانٹ دیئے جائیں یا فرق کیا جائے؟ کیونکہ بعض لوگ اپنا ہتھیار، گھوڑا، تیر، کمان، نیزہ، بھالا، زرہ، خود، سوار کا جانور اور کھانے کا سامان خود لے کر جاتے تھے اور بعض کو اسلامی حکومت کی طرف سے یہ سامان فراہم کیا جاتا تھا۔اسی طرح بعض لوگ بڑی بہادری اور بے جگری سے لڑتے تھے، بعض دبکے رہتے تھے، کچھ اگلی صف میں رہتے تھے جن پر براہِ راست دشمن کا وار ہوتا تھا، کچھ پیچھے رہتے تھے جو خطرہ سے دور رہتے تھے۔اب اگر ان سب کو برابر دیں تو کیوں دیں؟ اور اس کا ثبوت قرآن میں کہاں ہے؟ اور اگر فرق کریں تو کس حساب سے فرق کریں؟ قرآن سے اس کا حساب بتایئے، اور اگر کمانڈر کی رائے پر چھوڑ دیں تو قرآن مجید میں کہاں لکھا ہے کہ کمانڈر کی رائے پر چھوڑ دیں؟ اس کی دلیل دیجئے۔اگر قرآن میں ان مسئلوں کا کوئی حل نہیں ہے تو کیسے کہا جاتا ہے کہ قرآن میں سارے مسئلے بیان کر دیئے گئے ہیں.....!!!

۵۔ پانچواں سوال: قرآن میں حکم ہے کہ چوری کرنے والے مرد اور عورت کے ہاتھوں کو کاٹ دو۔اب سوال یہ ہے کہ دونوں ہاتھ کاٹیں یا ایک ہاتھ؟ اور اگر ایک ہاتھ کاٹیں تو داہنا کاٹیں یا بایاں؟ پھر اسے کاٹیں تو کہاں سے کاٹیں؟ بغل سے یا کہنی سے یا کلائی سے؟ یا ان کے بیچ میں کسی جگہ سے؟ آپ جو جواب بھی دیں اس کا ثبوت قرآن سے دیں اور اگر قرآن سے اس کا کوئی جواب نہیں دے سکتے تو کیسے کہتے ہیں کہ قرآن میں ہر مسئلہ بیان کر دیا گیا ہے۔

۶۔ چھٹا سوال: قرآن میں یہ ارشاد ہے کہ جب جمعہ کی نماز کیلئے پکارا جائے تو اللہ کے ذکر کی طرف دوڑو اور خرید و فروخت چھوڑ دو۔سوال یہ ہے کہ جمعہ کے دن کب پکارا جائے؟ کس نماز کیلئے پکارا جائے؟ کن الفاظ کے ساتھ پکارا جائے؟ جس نماز کے لئے پکارا جائے وہ نماز کیسے پڑھی جائے؟ ان ساری باتوں کا ثبوت قرآن سے دیجئے۔ورنہ تسلیم کیجئے کہ قرآن میں ہر مسئلہ بیان نہیں کیا گیا ہے۔صاف بات یہ ہے کہ قرآن میں رسول اللہ ﷺ کے طریقہ کی پیروی کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور جو باتیں ہم نے پوچھی ہیں ان باتوں میں اور اسی طرح زندگی کے بہت سارے مسئلے میں تنہا قرآن سے کسی طرح بھی معلوم نہیں ہوسکتا کہ رسول اللہ ﷺ کا طریقہ کیا تھا۔یہ طریقہ صرف حدیث سے معلوم ہوسکتا ہے۔اس لئے جب تک حدیث کو نہ مانیں، خود قرآن پر بھی عمل نہیں کر سکتے۔فی الحال یہی سوال پیش کر کے ہم آگے بڑھتے ہیں۔

انکارِ حدیث کے اصولی دلائل: اس ایک اصولی دلیل کا حال جان لینے کے بعد آیئے اب مدھو پوری محقق

صاحب کی زبانی چند اور اصولی دلیلیں سنئے۔ اس کے بعد ہمارا جواب ملاحظہ فرمائیے۔ موصوف نے خود ہی سوال قائم کیا ہے اور خود ہی جواب بھی دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

سوال: دین میں مصطلح ''حدیث'' کا کیا مقام ہے؟

جواب: کچھ نہیں کیونکہ.....

الف۔ دین حق ہے اور اس کی بنا علم ویقین پر ہے۔ جس کی شہادت خود اللہ اور اس کے سچے فرشتے دیتے ہیں: ﴿لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَا أَنْزَلَ إِلَيْكَ أَنْزَلَهُ بِعِلْمِهِ وَالْمَلَآئِكَةُ يَشْهَدُونَ وَكَفَىٰ بِاللّٰهِ شَهِيدًا﴾ [النساء: ۱۶۶]

ب۔ دین عملاً ﴿محمد رسول الله والذين معهٗ﴾ [الفتح:۲۹] کے ذریعہ بطریق احسن مکمل ہو چکا: ﴿اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا﴾ [المائدة: ۳]

ج۔ دین لوحِ قرآن پر لفظاً لفظاً اور حرفاً حرفاً بدرجہ اکمل محفوظ ہو گیا ہے: ﴿بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَّجِيدٌ فِي لَوْحٍ مَّحْفُوظٍ﴾ [البروج: ۲۸]

برعکس اس کے ہماری حدیثیں سب کی سب یکسر ظنی، غیر یقینی اور روایت بالمعنی ہیں۔ دین سے اس کا کیا تعلق؟ ﴿إِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا﴾ [النجم: ۸۲] یعنی حق کے مقابلے میں ''ظن'' کا کوئی مقام نہیں ہے: ﴿إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْأَنفُسُ وَلَقَدْ جَاءَهُم مِّن رَّبِّهِمُ الْهُدَىٰ﴾ [النجم: ۲۳] یعنی ''یہ لوگ محض ''ظن'' کے پیچھے دوڑتے ہیں، دراصل وہ اپنی من مانی کرتے ہیں حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے ان کو ہدایت پہنچ چکی ہے'' اور ایک مقام پر تو خاص کر مومنوں کو خطاب کر کے زیادہ ظن وگمان سے کوسوں دور رہنے کا حکم صادر کر دیا گیا ہے۔ بلکہ یہاں تک متنبہ کر دیا گیا ہے کہ بعض قیاس آرائیاں 'صریح' گناہ کے درجہ تک پہنچ جاتی ہیں۔ ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ﴾ [الحجرات: ۱۲]

وفات نبوی ﷺ کے سینکڑوں سال بعد بعض ایرانیوں نے اِدھر اُدھر کی محض سنی سنائی الکل پچو باتوں (جنہیں اقوال رسولؐ واصحاب رسولؐ سے منسوب کیا جاتا تھا) کا ذخیرہ جمع کر کے انہیں متفرق ومتضاد روایتوں کو 'صحیح حدیث' کا نام دے دیا اور بعد والوں نے بعض دینی اور سیاسی مصالح کی بنا پر اس کو (بزعم خویش) جزوِ دین سمجھ لیا، اور اس طرح تفقہ فی الدین اور تدبر فی القرآن کا دروازہ اپنے اوپر بند کر لیا۔ اس سے قبل یہی روایتیں جب تک زید، عمرو وبکر کی زبانوں پر بے روک ٹوک گشت کرتی رہیں ان کی کوئی خاص اہمیت نہ تھی، لیکن قید کتابت میں آنے اور ان پر 'صحیح'

کا لیبل چپکانے کے بعد انہیں ''فلاں نے فلاں سے کہا اور فلاں نے فلاں سے سنا'' ۔۔۔۔۔ روایتوں کو بدقسمتی سے دین کی اصل واساس سمجھ لیا گیا حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ مجموعہ ہائے روایات زیادہ سے زیادہ ایک طرح کے نیم تاریخی مواد کی حیثیت رکھتے ہیں اور بس۔ نیم تاریخی ہم نے اس لئے کہا کہ اولاً یہ فن تاریخ کے معیار پر پورے نہیں اترتے اور دوسرے یہ کہ ان کتب احادیث کی اکثر روایات قصہ گوؤں، واعظوں اور داستان سراؤں کی خودساختہ روایات اور من گھڑت کہانیاں ہیں۔ نیز ان جھوٹی روایات اور فرضی واقعات کا عوام میں خوب خوب پرچار کرنے کے ذمہ دار بھی یہی واعظین وقصہ گوؤں کا گروہ رہا ہے۔

ہماری ''حدیث'' کا ایک دوسرا تاریک پہلو بھی ہے جو پہلے سے زیادہ افسوس ناک ہے اور جسے ''اسلامی تاریخ'' کا ''المیہ'' کہنا چاہئے ہے۔ مثلاً حدیث کے مجموعوں میں ایسی روایتیں بھی بکثرت ملتی ہیں جو الزام تراشی، دروغ بافی اور فحش نگاری کا مرقع ہیں۔ اس پر ستم ظریفی یہ کہ ان مخرب اخلاق اور حیا سوز ''حدیثوں'' کو منسوب کیا جاتا ہے قرآن کی برگزیدہ شخصیتوں کی طرف (جیسے خود آنحضرت ﷺ، آپ کی ازواجِ مطہرات، خصوصاً حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا اور اصحاب رسول ﷺ، بالخصوص حضرت ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم) یا پھر سب وشتم کے تیر چلائے جاتے ہیں تو اگلی آسمانی کتابوں کی مثالی ہستیوں پر جیسے ابراہیم، یوسف، داؤد، سلیمان علیہم السلام اور مریم علیہا السلام وغیرہم۔ غرض صحفِ اُولیٰ کی منتخب شخصیتیں ہوں یا صحیفہ آخر کی پسندیدہ ہستیاں، کسی کی بھی عزت وآبرو راویانِ حدیث کی مشق ستم کا نشانہ بننے سے نہ بچ سکی۔ ﴿وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ﴾ [المرسلات: ۱۹] واضح رہے کہ یہ روایتیں مسیلمہ کذاب یا، ملامعین واعظ کاشفی جیسے مشہور دروغ گوؤں کی نہیں ہیں بلکہ عام مسلمانوں کے ''مایہ ناز اور فخر روزگار'' اماموں کے ثقہ راویوں کی ہیں جو آج تقریباً ہزار سال سے ان کتابوں کی زینت بنی ہوئی ہیں جو ''اصح الکتب بعد کتاب اللہ'' اور ''مثلہ معہ'' سمجھی جاتی رہی ہیں..... وائے گر در پس امروز بود فردائے!''

ان ''تحقیقاتِ عالیہ'' اور ''فرموداتِ طیبہ'' کے بعد مدھوپوری ''محقق'' صاحب ایک ٹھوس حقیقت کا عنوان لگا کر مزید ارشاد فرماتے ہیں:

''ہم مکلف ہیں ایمان لانے کے اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر، اور اللہ ورسول ﷺ پر ایمان لانے کے معنی ہیں اللہ کو حق جاننا اور محمد ﷺ پر نازل شدہ کتاب (قرآن) کو ماننا۔ بخلاف اس کے محض سنی سنائی باتیں جو صدہا سال تک ہر کہ ومہ کی زبان پر بے روک ٹوک گشت کرتی رہی ہوں اور بالآخر

انہیں محدثین نے بالکل غیر ذمہ دارانہ ذرائع سے معلوم کر کے اپنے بیاض میں نقل کیا ہو، ایسی غیر مستند اور غیر یقینی روایتوں کو اس صادق ومصدوق کی طرف منسوب کر کے انہیں ''سنت'' کا نام دینا اور ان پر ایمان لانے کیلئے مسلمانوں کو مجبور کرنا سراسر بے انصافی اور انتہائی زیادتی ہے۔

مروجہ انجیل کا نسخہ جسے خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں نے قلم بند کیا تھا (جو سفر وحضر ہر حال میں آپ کے رفیق وہم جلیس رہ چکے تھے) اگر محض اس لئے قابل اعتناء نہیں سمجھا جا سکتا کہ یہ کام حضرت مسیحؑ کی موجودگی میں نہیں بلکہ واقعہ رفع کے چالیس سال بعد انجام پایا تھا تو یہ روایتیں جنہیں نہ خود حضور ﷺ نے قلمبند کروایا نہ ہی آپؐ کے اصحابؓ میں سے کسی نے اس کی ضرورت سمجھی۔ بلکہ حضور ﷺ کے سینکڑوں سال بعد بعض عجمیوں نے زید، عمرو، وبکر سے پوچھ پوچھ کر لکھ لیا ہو، انہیں منزل من اللہ ماننے اور جزو دین قرار دینے کیلئے وجہ جواز کیا ہو سکتی ہے؟ اور یہ تدوین وترتیب کے دوران تقویٰ وطہارت کا اہتمام یعنی ایک ایک روایت کے قلم بند کرنے سے پہلے تازہ غسل ووضو اور دو رکعت نفل ادا کرنے کا شاخسانہ نفسیاتی اعتبار سے ذہنوں میں روایتوں کی تقدیس وتکریم کا جذبہ خواہ کتنا ہی پیدا کرے لیکن نفس روایات کا جہاں تک تعلق ہے، یہ حقیقت ہے کہ اگر انہیں آب زمزم سے بھی غسل ووضو کر کے لکھا گیا ہوتا تو بھی اس عمل سے ان کی صحت وسقم میں کوئی فرق نہیں آتا''۔

قرآن اللہ کا کلام ہے، اس کا یقین کرنے کیلئے ہمیں رسول ﷺ کی رسالت پر ایمان لانا ہوگا، بغیر اسی طرح روایتوں کو حدیث رسول ﷺ ماننے کیلئے ایک ایک روایت کے راوی پر ایمان لانا ہمارے لئے ناگزیر ہوگا بلکہ ہر روایت کے ہر سلسلہ اسناد میں جتنے راوی ہوں گے ہر ایک پر بلا استثناء ایمان لانا ہوگا۔ کیا ہمیں اللہ ورسول ﷺ کی طرف سے اَن گنت اصحاب اسماء الرجال پر ایمان لانے کی تکلیف دی گئی ہے، انا للہ.....''

جواب: مدھوپوری ''محقق'' صاحب کا ''سرمایہ تحقیقات'' ختم ہوا۔ اب آیئے اس پر ہمارا تبصرہ اور جائزہ ملاحظہ فرمایئے۔ ہم نے اس کے جواب میں انہیں لکھا تھا کہ آپ کا دعویٰ ہے کہ دین میں حدیث کا کوئی مقام نہیں اور اس دعویٰ کی آپ نے اپنے خیال میں دو دلیلیں لکھی ہیں۔ دوسری دلیل پر تو ہم آگے گفتگو کریں گے۔ پہلی دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ دین کی بناء علم ویقین پر ہے، احادیث ظنی ہیں۔ اس ضمن میں آپ نے وہ آیات نقل کی ہیں جن میں ظن کی مذمت کی گئی ہے اور ظن سے بچنے کا حکم دیا ہے۔ آپ کی یہ حرکت دیکھ کر بے ساختہ کہنا پڑتا ہے کہ آپ حضرات نہ تو قرآن کو

مانتے ہیں اور نہ اس کو سمجھنے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔!!

شریعت میں ظن اور ظنیات کی حیثیت: جناب عالی! قرآن مجید میں صرف ظن کی مذمت ہی نہیں کی گئی ہے بلکہ اس کی تعریف بھی کی گئی ہے، اسے اختیار کرنے کا حکم بھی دیا گیا ہے اور اسے مدارِ نجات بھی قرار دیا گیا ہے۔ سنیئے! فرمایا گیا ہے:

﴿لَوْلَا اِذْ سَمِعْتُمُوهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بِأَنْفُسِهِمْ خَيْرًا وَقَالُوا هَذَا اِفْكٌ مُّبِيْنٌ﴾ [النور: ۱۲] ''جب تم لوگوں نے (سیدہ عائشہؓ پر) الزام کے واقعہ کو سنا تو مؤمن مردوں اور مؤمن عورتوں نے اپنے نفسوں کے ساتھ اچھا ظن کیوں نہ قائم کیا؟ اور کیوں نہ کہا کہ یہ کھلی ہوئی جھوٹی تہمت ہے''۔

غور فرمایئے! اس میں صرف ''ظن'' کو اختیار ہی کرنے کا مطالبہ نہیں ہے بلکہ اس کی بنیاد پر ایک معاملہ کے بارے میں فیصلہ کن رائے قائم کرنے کا بھی مطالبہ ہے۔ ایک جگہ فرمایا گیا:

﴿وَاسْتَعِيْنُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخَاشِعِيْنَ ○ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ أَنَّهُم مُّلَاقُوا رَبِّهِمْ وَأَنَّهُمْ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ﴾ [البقرة: ۴۵ - ۴۶] ''صبر اور نماز سے مدد حاصل کرو اور بے شک یہ بھاری ہے مگر ان ڈرنے والوں پر جو یہ ''ظن'' رکھتے ہیں کہ انہیں اپنے رب سے ملنا ہے اور یہ کہ وہ اسی کی طرف پلٹ کر جائیں گے''۔

گویا قیامت کے وقوع اور اللہ سے ملاقات کا ''ظن'' رکھنا ایمان کی علامت ہے۔ ایک اور مقام پر ارشاد ہے: ﴿اَلَا يَظُنُّ أُولَئِكَ أَنَّهُم مَّبْعُوثُونَ ○ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ﴾ [المطففين: ۴، ۵] ''کیا وہ لوگ ظن نہیں رکھتے کہ وہ ایک بڑے دن کیلئے اٹھائے جائیں گے''۔

گویا بعث کا ظن نہ رکھنا عدمِ ایمان کی علامت ہے اور ڈنڈی مارنے جیسی برائیوں کا سبب ہے، ایک اور جگہ ارشاد ہے:

﴿فَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِيَمِيْنِهِ فَيَقُوْلُ هَاؤُمُ اقْرَؤُوا كِتَابِيَهْ ○ اِنِّيْ ظَنَنْتُ أَنِّيْ مُلَاقٍ حِسَابِيَهْ ○ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ○ فِيْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ○ [الحاقة: ۱۹ تا ۲۲] ''قیامت کے دن جس شخص کی کتاب اس کے دائیں ہاتھ میں دی جائے گی وہ کہے گا، آؤ! میری کتاب پڑھو۔ میں ظن رکھتا تھا کہ میں اپنے حساب سے ملوں گا۔ پھر وہ پسندیدہ زندگی یعنی بلند و بالا جنت میں ہوگا''۔

لیجئے جناب! یہاں ایک ''ظنی'' عقیدے پر جنت مل رہی ہے اور آپ ظن اور ظنیات کو جہنم میں دھکیلنے پر تلے بیٹھے ہیں۔ سیدنا داؤد علیہ السلام نے ظن کی بنیاد پر توبہ استغفار کیا تو ان کے اس عمل کو مدح و تعریف کے

سیاق میں ذکر کیا گیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَظَنَّ دَاوُدُ أَنَّمَا فَتَنَّاهُ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهُ وَخَرَّرَا كِعاً وَأَنَابَ﴾ [ص: ۲۴] ''داؤد علیہ السلام نے ظن کیا کہ ہم نے اسے آزمائش میں ڈال دیا ہے پس انہوں نے اپنے رب سے مغفرت مانگی اور رکوع کرتے ہوئے گر پڑے اور اللہ کی طرف جھک گئے''۔

آپ ظنی چیز کا دین سے کوئی تعلق ہی نہیں سمجھتے اور قرآن ظن پر دین کے ایک حکم کا دارومدار رکھتا ہے۔ ارشاد ہے:

﴿فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَن يَتَرَاجَعَا إِن ظَنَّا أَن يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ﴾ [البقرة: ۲۳۰] ''یعنی'' مطلقہ ثلاثہ کا دوسرا شوہر اگر طلاق دے دے تو (پہلے شوہر اور اس کی مطلقہ) ان دونوں پر کوئی حرج نہیں کہ آپس میں رجوع کر لیں (یعنی پھر بذریعہ نکاح اکٹھے ہو جائیں) اگر یہ ظن کریں کہ وہ دونوں اللہ کی حدود قائم کر سکیں گے''۔

غزوۂ تبوک میں جو تین مؤمنین خالصین بلا عذر شریک نہ ہوئے تھے، ان کی توبہ بھی جس مرحلے کے بعد قبول کی گئی، اس کا ذکر قرآن میں ان الفاظ کے ساتھ آیا ہے:

﴿وَعَلَى الثَّلَاثَةِ الَّذِينَ خُلِّفُوا حَتَّى إِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ أَنفُسُهُمْ وَظَنُّوا أَن لَّا مَلْجَأَ مِنَ اللَّهِ إِلَّا إِلَيْهِ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوبُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ﴾ [التوبة: ۱۱۸] ''اور اللہ نے ان تین افراد کی توبہ بھی قبول کی جنہیں پیچھے چھوڑ دیا گیا تھا یہاں تک کہ جب ان پر زمین اپنی وسعت کے باوجود تنگ ہو گئی اور ان کی جان پر بن آئی اور انہوں نے یہ ظن قائم کر لیا کہ اللہ کے سوا کوئی جائے پناہ نہیں۔ پھر اللہ نے ان پر رجوع کیا تا کہ وہ توبہ کریں۔ بیشک اللہ توبہ قبول کرنے والا رحیم ہے''۔

لیجئے جناب! کتنی صاف بات ہے کہ جب ان پیچھے رہ جانے والوں نے حالات کی سختی کا مزہ چکھ لیا اور یہ ''ظن'' قائم کر لیا کہ اللہ کے علاوہ کوئی جائے پناہ نہیں تو اللہ نے ان کی توبہ قبول کر لی۔ یعنی انہیں اللہ کی رحمت و مغفرت ان کے اسی ظن کے نتیجہ میں حاصل ہوئی۔

یہ تو یہ اسلام نے اسلامی عدالت کے تمام فیصلوں کی بنیاد صرف دو عادل گواہوں پر رکھی ہے، اس سے صرف زنا کا کیس مستثنیٰ ہے۔ لیکن ان دو عادل گواہوں کی عدالت و ثقاہت کس درجہ کی ہوگی، اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اگر وہ نماز کے بعد اللہ کی قسم اور اپنے اخلاص کا واسطہ دے کر گواہی دے رہے ہوں، تب بھی قرآن نے ان کے بارے میں

اس احتمال کو قبول کیا ہے کہ وہ جان بوجھ کر غلط بیانی سے کام لے سکتے ہیں۔ ملاحظہ ہو [سورۃ المائدہ: ۱۰۶ تا ۱۰۸] بلکہ گواہی کے سلسلے میں مزید ایک قانونی شق یہ رکھی ہے کہ اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی کافی ہوگی۔ [البقرۃ: ۲۸۳].....اور خود ہی یہ بھی بتلا دیا ہے کہ عورتوں کی تعداد ایک کے بجائے دو اس لئے رکھی جا رہی ہے کہ:

﴿ أَن تَضِلَّ اِحْدَا هُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدَا هُمَا الْأُخْرَىٰ﴾ [البقرۃ: ۲۸۲] ''اگر ایک عورت معاملہ کو بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے''۔ یعنی ایسی گواہی بھی قبول کی جائے گی جو خود گواہی دینے والے کو یاد نہیں ہے۔ بلکہ گواہی دینے والا انسان دوسرے کی یاددہانی کی بنیاد پر گواہی دے رہا ہے۔

کہئے جناب عالی! اس قسم کی گواہی ''یقینیات'' کے کس درجہ سے تعلق رکھتی ہے؟ اور یہ ڈھیل تو رہی نظام عدالت کے سلسلے میں، باقی رہیں خبریں تو ان کے سلسلے میں اس سے بھی زیادہ وسعت اور گنجائش رکھی گئی ہے۔ حکم دیا:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اِن جَاءَ كُمْ فَاسِقٌ بِنَبَأٍ فَتَبَيَّنُوْا﴾ [الحجرات: ۶] ''اے ایمان والو! اگر تمہارے پاس کوئی فاسق آدمی کوئی خبر لائے تو اس کی تحقیق کر لو.....الخ'' اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی صاحبِ تقویٰ اور صالح آدمی خبر لائے تو تحقیق بھی کرنے کی ضرورت نہیں۔

جناب محترم! جب قرآن میں نہ صرف ظن کی تعریف کی گئی ہو بلکہ اس پر دین کے بعض احکامات کا دارومدار رکھا گیا ہو، اسی پر پورے نظامِ عدالت کی بنیاد رکھی گئی ہو، اسی ظن کی بنیاد پر فیصلہ کن رائے اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہو تو آپ کو یہ بات کہاں تک زیب دیتی ہے کہ آپ احادیث پر ''ظنی'' ہونے کی پھبتی چست کریں۔ آپ دوسروں کو تفقہ فی الدین اور تدبر فی القرآن سے محروم قرار دیتے ہیں، درآں حالیکہ اس محرومی کے شکار درحقیقت آپ خود ہیں۔ محترم کہنا پڑتا ہے کہ: **ایاز قدر خود بشناس**

شاید آپ اس موقع پر لغت کھول کر بیٹھ جائیں اور چیخنا چلانا شروع کر دیں کہ دیکھو یہ شخص ''ظن'' کے مختلف معانی کو ایک دوسرے کے ساتھ گڈمڈ کر رہا ہے، اس لئے میں آپ کی اس چیخ پکار سے پہلے ہی یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ کارِ خیر میں نہیں، آپ انجام دے رہے ہیں۔ آخر اس سے بڑھ کر دھاندلی اور زبردستی کیا ہو سکتی ہے کہ آپ قرآن کی ان تمام آیات اور اسلام کے اس سارے نظام کو پس پشت ڈال دیں جن میں ''ظن'' کو دین اسلام کا جزوِ لاینفک قرار دیا گیا ہے اور قرآن کی دو تین آیتوں کو پیش کر کے لفظِ ''ظن'' کے مفہوم کو غلط رنگ دیتے ہوئے یہ فیصلہ ٹھونک دیں کہ ''ظن'' کیلئے دین میں کوئی گنجائش نہیں۔ اس لئے ذخیرۂ احادیث جو یکسر ظنی اور غیر یقینی ہے، اس کا دین میں کوئی مقام نہیں۔ بتایئے! ہم نے جو آیات پیش کی ہیں ان کو ملحوظ رکھتے ہوئے آپ کے اس فیصلے پر اس کے سوا کیا کہا جائے کہ:

؎ آں کس کہ نداند و بداند کہ بداند در جہل مرکب ابدالدہر بماند

(جاری ہے)